ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2629

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: اسلام کا معاشرتی وسیاسی نظام (2629) • سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: پاکستان میں رشوت اور کرپشن کے مسائل (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ پاکستان میں رشوت اور کرپشن کے مسائل بیان کریں۔ (20)

تعارف

رشوت اور کرپشن پاکستان کے سنگین ترین سماجی و انتظامی مسائل میں سے ایک ہے۔ کرپشن سے مراد ذاتی مفاد کے لیے سرکاری یا دیے گئے اختیار کا ناجائز استعمال ہے، جبکہ رشوت کرپشن کی سب سے عام صورت ہے جس میں جائز کام کے لیے بھی ناجائز رقم یا فائدہ دینا اور لینا شامل ہوتا ہے۔ جب کسی تھانے، کچہری، دفتر یا تعلیمی ادارے میں عام آدمی کو اپنا جائز حق لینے کے لیے بھی سفارش یا رقم کا سہارا لینا پڑے تو سمجھ لینا چاہیے کہ نظام اپنے بنیادی مقصد یعنی عوام کی خدمت سے ہٹ چکا ہے۔ کرپشن صرف چند افراد کے مال بنانے کا نام نہیں؛ یہ پورے معاشرے کا اعتماد کھو دیتی ہے۔

اس جواب میں پاکستان میں رشوت و کرپشن کی اقسام، اس کے پھیلنے کے اسباب، اس کے معاشی، سماجی و سیاسی نقصانات اور انسداد کے لیے قائم اداروں و تجاویز کا جائزہ لیا جائے گا۔ اسلامی نقطہ نظر سے بھی یہ واضح کیا جائے گا کہ رشوت کو دین نے کس سختی سے ممنوع قرار دیا ہے اور دیانت و احتساب کا نظام کیا ہے۔ یہ بحث کسی فرد یا جماعت کی طرف الزام تراشی کے بجائے ایک ملکی مسئلے کا علمی تجزیہ ہے۔ اس کے حل کے لیے محض اخلاقی وعظ کافی نہیں بلکہ قانون، اداروں، شفافیت اور سماجی رویوں کی مجموعی تبدیلی درکار ہے۔

کرپشن کی اقسام اور صورتیں

پاکستان میں کرپشن کی کئی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ سب سے عام چھوٹی سطح کی کرپشن ہے جس میں روزمرہ سرکاری کاموں کے لیے رشوت لی جاتی ہے، مثلاً دستاویزات کی منظوری، لائسنس، داخلے یا مقدمات کی پیش رفت کے لیے غیر قانونی ادائیگی۔ دوسری صورت بڑی سطح کی کرپشن ہے جس میں اربوں روپے کے ٹھیکے، قرضوں کی معافی، سرکاری زمین کی الاٹمنٹ اور درآمدات و برآمدات کے بڑے سودوں میں کمیشن اور لوٹ مار ہوتی ہے۔ تیسری صورت اختیارات کا سیاسی استعمال ہے جس میں اقربا پروری، ملازمتوں کی فروخت اور فنڈز کی من مانی تقسیم شامل ہے۔ اس کے علاوہ نجی شعبے میں بھی ملاوٹ، ٹیکس چوری اور دھوکا دہی کرپشن ہی کی صورتیں ہیں۔

رشوت کے علاوہ کرپشن کی پوشیدہ صورتیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملازم کا دفتری وقت میں نجی کام کرنا، سرکاری گاڑی و وسائل کا ذاتی استعمال، فائلوں کو دانستہ روک کر دباؤ بنانا، کمیشن کے بدلے ناقص مواد استعمال کر کے سڑکوں اور عمارتوں کا معیار گرانا اور امتحانات میں نقل کی سرپرستی کرنا بھی بدعنوانی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں کی رو میں بہت سی صورتیں معمول سمجھ کر اختیار کر لی جاتی ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ رشوت کو نظام میں آسانی کا ذریعہ کہنے لگتے ہیں۔ یہی معمول بن جانا اصل مسئلہ ہے، کیونکہ جب غلط کام باعث شرم نہ رہے تو اسے روکنا قانون کے لیے بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

جدول: کرپشن کی اقسام اور ان کی مثالیں

قسم	مثالیں	بنیادی نقصان
چھوٹی سطح کی رشوت	عام سرکاری کاموں کے لیے ناجائز ادائیگی	عام آدمی کی تذلیل اور اعتماد کا خاتمہ
بڑی سطح کی بدعنوانی	ٹھیکوں، قرضوں اور زمینوں میں اربوں کا نقصان	خزانے کی لوٹ اور قومی منصوبوں کی تباہی
اقربا پروری	ملازمت و ترقی میں رشتہ داری و سفارش	میرٹ کا قتل اور نااہلی کا فروغ
انتظامی غبن	فنڈز کی خیانت، جعلی بلوں کا اجراء	ترقیاتی وسائل کی بربادی
نجی شعبے کی بدعنوانی	ملاوٹ، ٹیکس چوری، دھوکا دہی	صارف کا استحصال اور معیشت کو نقصان

کرپشن کے اسباب

کرپشن کے اسباب سماجی، معاشی اور انتظامی سبھی نوعیت کے ہیں۔ معاشی اعتبار سے سرکاری ملازمین کی کم تنخواہیں اور بڑھتی مہنگائی رشوت کے لیے آسان عذر بنتی ہیں، لیکن یہی سب کچھ نہیں، کیونکہ بڑے عہدوں پر موجود مالدار لوگوں کی کرپشن لالچ اور بے حسی کی وجہ سے ہوتی ہے، مجبوری کی وجہ سے نہیں۔ سماجی سطح پر تیز دولت مندی کی قدر، نمود

و نمائش اور غلط ذرائع سے مال بنانے والے کی عزت بڑھنے سے بد عنوانی کو قبولیت ملتی ہے۔ سیاسی نظام میں انتخابی اخراجات کا اسراف بھی ایک بڑا سبب ہے؛ جب امیدوار کروڑوں روپے لگا کر عہدہ حاصل کرتا ہے تو وہ اقتدار میں آ کر اس سرمائے کی واپسی کو مقصد بنالیتا ہے۔

ادارہ جاتی اسباب میں قانون کی کمزور عمل درآمد، مقدمات کی طویل مدت، احتسابی اداروں کا سیاسی دباؤ میں آنا اور افسران کی بار بار من مانی تبدیلیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شفافیت کی کمی بنیادی سبب ہے؛ جب فائلوں، ٹھیکوں اور فیصلوں کی معلومات عوام سے چھپائی جاتی ہیں تو بد عنوانی کے مواقع بڑھتے ہیں۔ بعض محکموں میں پیچیدہ قوانین اور غیر ضروری قانونی مراحل بھی اسی لیے برقرار رکھے جاتے ہیں کہ وہ رشوت کا جواز بنے رہیں۔ ضمیر کی نگرانی ختم ہونے کو بھی بنیادی سمجھنا چاہیے؛ جس معاشرے میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس کمزور ہو جائے اور قانون سے بچ نکلنا ہنر سمجھا جائے وہاں کسی بیرونی نگرانی سے مکمل روک ممکن نہیں رہتی۔

کرپشن کے نقصانات اور اسلامی نقطہ نظر

کرپشن کے نقصانات ہر شعبے میں ظاہر ہیں۔ معاشی لحاظ سے ترقیاتی فنڈز لوٹ کے منصوبے ناقص اور نامکمل رہتے ہیں، سڑکیں جلد ٹوٹتی ہیں، غیر ملکی سرمایہ کار بد عنوان ماحول سے گریز کرتے ہیں اور عام آدمی کی قوت خرید کمزور ہوتی جاتی ہے۔ سماجی لحاظ سے میرٹ ختم ہونے سے نوجوانوں میں مایوسی، صلاحیت یافتہ لوگوں کی بیرون ملک منتقلی اور جرائم کی طرف رجحان بڑھتا ہے۔ سیاسی لحاظ سے حکومتوں پر اعتماد اٹھ جاتا ہے اور عوام نظام سے بیزار ہو کر پر تشدد تبدیلیوں کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ سب سے بڑا نقصان اخلاقی ہے کہ برائی برائی نہیں رہتی اور اگلی نسل اسے معمول سمجھ کر اپناتی ہے۔ بین الاقوامی ادارے جو بد عنوانی کے مرتب کردہ اشاریے شائع کرتے ہیں ان میں پاکستان کی کمزور نمائش بھی اس داخلہ بد انتظامی کی عکاس سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے رشوت دینا اور لینا دونوں سخت ممنوع ہیں۔ احادیث میں رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت کی گئی ہے، کیونکہ یہ فعل عدل کے نظام کو خریدنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح غبن یعنی عوام کے مال میں خیانت کو بھی سخت گناہ قرار دیا گیا ہے اور قیامت کے دن اس کی جواب دہی کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں احتساب کا نظام اور مظالم کی سماعت کے خصوصی ادارے اسی مقصد کے لیے قائم ہوئے

تھے۔ یہ تعلیمات اس بات کی دلیل ہیں کہ دینی کردار کی تشکیل کرپشن کے خلاف سب سے بنیادی حفاظتی دیوار ہے، تاہم شرعی احکام کا قانونی اطلاق ریاستی قوانین اور عدالتوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے، کسی فرد کو اپنے ہاتھ سے سزا دینے کا اختیار نہیں ہوتا۔

انسداد کرپشن کے ادارے اور حل

پاکستان میں انسداد کرپشن کے لیے نیب (قومی احتساب بیورو)، ایف آئی اے، صوبائی محکمہ جات اینٹی کرپشن، عدالتیں اور محاسب اعلیٰ کا ادارہ موجود ہیں۔ نیب نے کئی بڑے مقدمات بنائے اور لوٹی ہوئی دولت کا کچھ حصہ بازیاب بھی کروایا۔ مگر تنقیدی جائزہ یہ بتاتا ہے کہ احتساب کا تاثر منتخب ہونے، مقدمات کے سالہا سال لٹکنے اور قانون کے بار بار تبادلے سے اس کی افادیت کم رہی ہے۔ آڈیٹر جنرل کی رپورٹیں ہر سال اربوں کی بے قاعدگیوں کی نشاندہی کرتی ہیں لیکن ان پر عمل کم ہی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ اداروں کی عدم موجودگی کا نہیں، ان کی خودمختاری، استقام اور اہلیت کا ہے۔

حل کے لیے کثیر الجہت اقدامات ناگزیر ہیں۔ اولاً قوانین سادہ کیے جائیں اور رشوت والی گنجائش رکھنے والے غیر ضروری مراحل ختم کر کے خدمات کو شفاف آن لائن نظام میں منتقل کیا جائے، کیونکہ غیر ذاتی نظام میں رشوت کا موقع کم ہو جاتا ہے۔ ثانیاً احتسابی اداروں کو سیاسی دباؤ سے آزاد، پیشہ ورانہ اور خود بھی احتساب کے دائرے میں رکھا جائے اور مقدمات کے فیصلے مقررہ مدت میں ہونے چاہئیں۔ ثالثاً سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور سہولتوں کو معقول بنا کر ان کی تربیت میں دیانت پر زور دیا جائے۔ رابعاً سماجی سطح پر اسکولوں، میڈیا اور خطبات کے ذریعے بدعنوان کو سماجی نفرت کا نشان بنایا جائے اور ایماندار افراد کی قدر افزائی ہو۔ یہ تدابیر مل کر ہی کرپشن کو لاحق مرض کے درجے سے کم قابل ترین سطح تک لا سکتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ رشوت و کرپشن پاکستان کے ترقیاتی عمل کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی جڑیں کمزور احتساب، غیر شفاف نظام، سیاسی مفادات اور اخلاقی کمزوری میں پیوست ہیں اور اس کے نقصانات معیشت سے لے کر نوجوان نسل کی نفسیات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسلام نے رشوت اور غبن کی سخت ممانعت کر کے دیانت کو ایمان کا حصہ

قرار دیا ہے؛ اس اخلاقی بنیاد کے ساتھ جدید شفاف انتظامی نظام، خود مختار احتساب اور عوامی نگرانی کو جوڑا جائے تو بہتری ممکن ہے۔ طالب علم کے لیے اس بحث کا سبق یہ ہے کہ تبدیلی کا آغاز اپنے عمل سے ہوتا ہے؛ امتحان میں نقل، دفتر میں کام چوری اور لین دین میں بد دیانتی سے اجتناب ہی وہ کردار ہے جو کل کے نظام کو بدلے گا۔

سوال نمبر 2: پاکستان میں آبادی کے مسائل اور ان کا حل (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ پاکستان میں آبادی کے مسائل اور ان کا حل بیان کریں۔ (20)

تعارف

پاکستان دنیا کے گنجان آباد ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ حالیہ مردم شماری (2023ء) کے مطابق ملک کی آبادی تقریباً [illegible] کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور آبادی میں اضافے کی شرح بھی خطے کے دیگر ممالک کے مقابلے میں بلند ہے۔ آبادی بذات خود برائی نہیں؛ محنت کش اور تعلیم یافتہ آبادی قوم کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آبادی کی رفتار وسائل، روزگار، تعلیم اور صحت کی سہولتوں کی فراہمی کی رفتار سے آگے نکل جائے۔ پاکستان کا اصل مسئلہ یہی عدم توازن ہے کہ ہر سال لاکھوں نئے افراد خوراک، تعلیم، علاج اور ملازمت کے متقاضی بنتے ہیں جبکہ نظام کی استعداد اتنی تیزی سے نہیں بڑھتی۔

اس جواب میں پہلے پاکستان کی آبادی کی موجودہ کیفیت اور بڑھوتری کی رفتار کا جائزہ لیا جائے گا، پھر آبادی کے بڑھنے کے اسباب بیان ہوں گے۔ اس کے بعد اس کے معاشی، سماجی، تعلیمی اور صحت سے متعلق مسائل کی تفصیل آئے گی۔ آخر میں حل کے لیے تجاویز یعنی تعلیم بالخصوص خواتین کی تعلیم، خاندانی منصوبہ بندی کی جائز سہولتیں، ماں بچے کی صحت اور عوامی آگاہی جیسے اقدامات پر بحث کر کے نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ یہ تمام بحث اعداد و شمار کے معتدل اور احتیاط پر مبنی استعمال کے ساتھ پیش کی جائے گی تاکہ دعوے غلط اعداد پر مبنی نہ ہوں۔

آبادی کی موجودہ صورت حال اور اسباب

آزادی کے وقت موجودہ پاکستان کے علاقوں کی آبادی تقریباً ساڑھے تین کروڑ سے بھی کم تھی۔ اس کے بعد ہر مردم شماری میں اس میں بڑا اضافہ ہوتا رہا؛ 1998ء میں آبادی تقریباً تیرہ کروڑ، 2017ء میں تقریباً بیس کروڑ اسی لاکھ اور 2023ء میں تقریباً چوبیس کروڑ پندرہ لاکھ تک پہنچ گئی۔ حالیہ مردم شماری میں سالانہ شرح اضافہ تقریباً اڑھائی فیصد کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ اگر اسی رفتار سے اضافہ جاری رہا تو آبادی پچیس برسوں میں دوگنی ہو سکتی ہے جس کا دباؤ زمین، پانی، شہروں اور خزانے پر ناقابل برداشت ہو سکتا ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے، یہ موقع بھی ہے اور اگر روزگار و تعلیم نہ ملا تو سنگین مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔

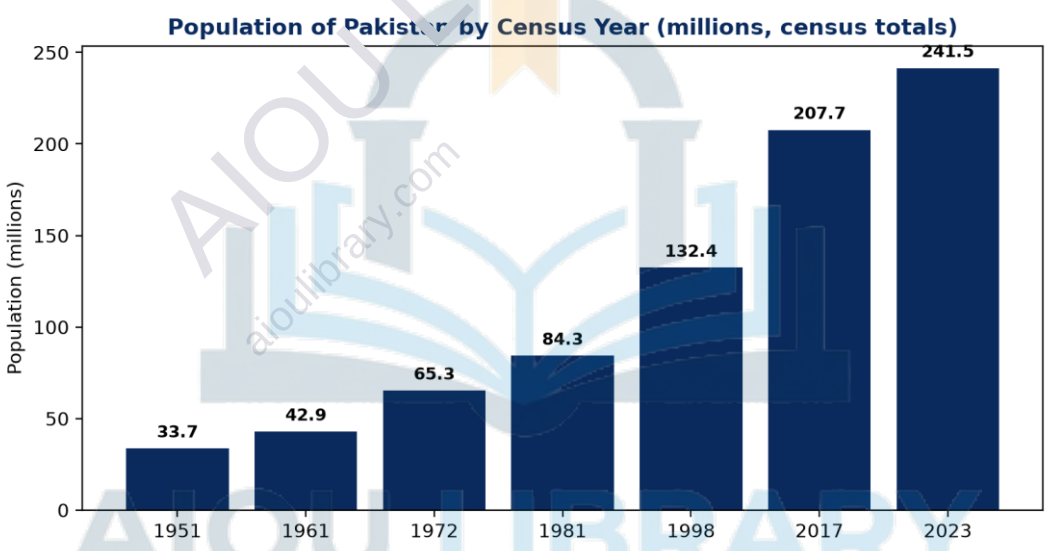

شکل: پاکستان کی آبادی مختلف مردم شماریوں میں، تقریبی اعداد (کروڑ میں)

آبادی میں تیزی کے اسباب متعدد ہیں۔ سب سے بڑا سبب شرح پیدائش کا بلند رہنا اور شرح اموات میں طبی سہولتوں کی وجہ سے کمی ہے، جس سے فرق بڑھتا گیا۔ دیہی علاقوں میں اولاد نرینہ کی شدید خواہش، بیٹوں کو بڑھاپے کا سہارا سمجھنا اور کم عمری کی شادیاں بڑے خاندان کو فروغ دیتی ہیں۔ خواتین میں خواندگی کی کمی اور خاندانی منصوبہ بندی کی سہولتوں تک رسائی کا فقدان بھی اہم اسباب ہیں۔ بعض مذہبی غلط فہمیاں اور موضوع پر کھل کر گفتگو سے گریز بھی مسئلے کو حل سے دور رکھتے ہیں، حالانکہ دوران حمل کے وقفے

اور ماں بچے کی صحت کے حوالے سے علماء کی اکثریت مناسب وقفے کو جائز قرار دیتی رہی ہے؛ البتہ یہ شرعی تجزیہ اہل علم کا دائرہ ہے اور یہاں صرف مسئلے کے اسباب کی سماجی سطح پر نشاندہی مقصود ہے۔

جدول: آبادی میں اضافے کے اہم مسائل اور ان کے اثرات

شعبہ	مسئلہ	نتیجہ
معیشت	بے روزگاری اور کم فی کس آمدنی	غربت اور مہنگائی میں اضافہ
تعلیم	اسکولوں میں رش اور اخلے سے باہر بچے	شرح خواندگی میں سست بہتری
صحت	اسپتالوں پر دباؤ، ماں بچے کی اموات	خدمات کے معیار میں کمی
رہائش و شہر	کچی آبادیاں اور سہولتوں کی کمی	آلودگی اور جرائم کا فروغ
ماحول	پانی کی کمی اور زرعی زمین کا سکڑاؤ	غذائی تحفظ کو خطرات

آبادی کے بڑھتے ہوئے مسائل

معاشی میدان میں آبادی کے دباؤ کا سب سے نمایاں اثر بے روزگاری ہے۔ ہر سال لاکھوں نوجوان ملازمت کے بازار میں داخل ہوتے ہیں مگر صنعتی و سروس شعبے اتنی ملازمتیں پیدا نہیں کر پاتے۔ اس کا نتیجہ غربت، چھوٹے موٹے جرائم، بچوں کی مشقت اور غیر قانونی ہجرت کی کوششوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ فی کس آمدنی میں بہتری سست رہتی ہے کیونکہ جتنی ترقی ہوتی ہے اس کا بڑا حصہ بڑھتی آبادی میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ زرعی زمین کی مسلسل تقسیم سے کاشت کار کے حصے چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کے باوجود غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے درآمدات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

سماجی شعبوں میں صورت حال مزید گھمبیر ہے۔ تعلیمی ادارے مطلوبہ تعداد سے کہیں کم ہیں؛ کروڑوں بچے آج بھی اسکول سے باہر ہیں اور جو اسکولوں میں ہیں انہیں بھری ہوئی کلاسوں اور کم سہولتوں کا سامنا ہے۔ صحت کے مراکز پر مریضوں کا رش اتنا زیادہ ہے کہ سرکاری اسپتالوں میں معیاری علاج مشکل ہو گیا ہے اور وبائی امراض کے پھیلاؤ کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ شہروں میں کچی آبادیاں، پینے کے صاف پانی کی کمی، نکاسی آب کے مسائل اور فضائی آلودگی نے شہری زندگی کو مشکل بنا دیا ہے۔ پانی کی فی کس دستیابی میں مسلسل کمی بھی اسی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ یوں آبادی کا مسئلہ درحقیقت ہر دوسرے ترقی مسئلے کی جڑ میں موجود ہے۔

آبادی کے مسائل کا حل

اس مسئلے کا حل آبادی پر جابرانہ کنٹرول نہیں بلکہ فلاحی اور متوازن حکمت عملی ہے۔ سب سے مؤثر ذریعہ تعلیم خصوصاً خواتین کی تعلیم ہے۔ دنیا بھر کے تجربے سے ثابت ہے کہ پڑھی لکھی خاتون دیر سے شادی کرتی ہے، بچوں کی صحت و تعلیم کا بہتر خیال رکھتی ہے اور خاندان کا حجم سوچ سمجھ کر متعین کرتی ہے۔ اس لیے لڑکیوں کی ثانوی تعلیم تک مکمل رسائی کو قومی ترجیح بنانا چاہیے۔ دوسرا اقدام بچوں کی بقا کی شرح بہتر بنانا ہے؛ جب والدین کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کے بچے زندہ رہیں گے تو وہ بڑے خاندان کی مجبوری محسوس نہیں کرتے۔ ویکسین، ماں بچے کی دیکھ بھال اور غذائیت کے پروگرام اس سمت میں ناگزیر ہیں۔

تیسرا اقدام خاندانی منصوبہ بندی کی معیاری اور باعزت سہولتوں کی فراہمی ہے۔ دیہی صحت مراکز اور لیڈی ہیلتھ ورکرز کے نظام کو مضبوط کر کے مشورہ و خدمات کو ہر گھر تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر علماء، اساتذہ اور میڈیا کو شامل کر کے غلط فہمیاں دور کرنا ضروری ہے تاکہ وقفے اور صحت سے متعلق جائز اقدامات کو سماجی قبولیت ملے۔ چوتھا اقدام معاشی ہے: چھوٹی صنعتوں، ہنرمندی کی تربیت اور خواتین کے روزگار کے مواقع بڑھانے سے نوجوان آبادی بوجھ کے بجائے طاقت بن جاتی ہے۔ اسی طرح شادی کی قانونی عمر پر عمل، بچوں کی پیدائش کے اندراج کا بہتر نظام اور آبادی سے متعلق درست اعداد و شمار بھی پالیسی سازی کے لیے بنیادی ہیں۔ حکومت، علماء، میڈیا اور سول سوسائٹی کا مشترکہ کردار ہی اس طویل المدت تبدیلی کو ممکن بنا سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں آبادی کا مسئلہ وسائل اور آبادی کے عدم توازن کا مسئلہ ہے، جس کے اثرات بے روزگاری، غربت، تعلیم و صحت کی کمی اور ماحولیاتی دباؤ کی صورت میں ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔ اس کا حل جبر میں نہیں بلکہ تعلیم، خواتین کی بااختیاری، ماں بچے کی صحت، خاندانی منصوبہ بندی کی سہولتوں اور روزگار کی منصوبہ بندی کے امتزاج میں ہے۔ سب سے اہم سبق یہ ہے کہ آبادی کی منصوبہ بندی کو سیاست سے اوپر رکھ کر قومی اتفاق رائے سے جاری رکھا جائے، کیونکہ اس کے نتائج نسلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر آج سنجیدہ قدم نہ اٹھایا گیا تو معاشی ترقی کی ہر کوشش بڑھتی آبادی کے سیلاب میں دب جائے گی، اور اگر دانشمندی سے کام لیا گیا تو یہی نوجوان آبادی ملک کی ترقی کا سب سے بڑا سرمایہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر 3: اسلام میں سیاست کا مقام (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ اسلام میں سیاست کا مقام بیان کریں۔ (20)

تعارف

اسلام میں سیاست کا مقام جدید دور کی اہم ترین فکری مباحث میں سے ایک ہے۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے بعد مذہب اور سیاست کی علمی علاحدگی کا تصور فروغ پایا اور سیکولرزم نے سیاست کو مذہبی اقدار سے بالکل الگ شعبہ قرار دیا۔ اس کے برعکس اسلام ایک جامع نظام حیات ہے جو انسان کی انفرادی زندگی کے ساتھ اجتماعی زندگی، یعنی معاشرے اور ریاست کے معاملات، کے بارے میں بھی رہنمائی دیتا ہے۔ اسلامی تصور میں سیاست سے مراد محض اقتدار کی کشمکش نہیں بلکہ رعایا کے امور کی اصلاح، عدل کا قیام اور فلاح عامہ کا انتظام ہے۔ فقہاء نے سیاست شرعیہ کی اصطلاح اسی مفہوم میں استعمال کی ہے۔

اس جواب میں اسلام میں سیاست کے مقام کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا جائے گا۔ پہلے سیاست کے مفہوم اور دین و ریاست کے تعلق کی اسلامی تعبیر پیش ہو گی، پھر قرآنی اصول یعنی حاکمیت الٰہی، خلافت انسانی، شوریٰ، عدل اور امانت کا ذکر آئے گا۔ اس کے بعد ریاست مدینہ کے عملی نمونے، حکمران کے فرائض و احتساب اور دور حاضر میں اس بحث کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔ یہ بحث خالصتاً علمی و نظری ہے؛ موجودہ آئینی و سیاسی معاملات میں اطلاق آئین، قانون اور اہل علم و اہل اختیار کے دائرے میں ہوتا ہے جس کا تفصیلی فیصلہ اسی گائیڈ کے دائرے سے باہر ہے۔

سیاست کا مفہوم اور اسلام کا جامع تصور

عربی میں سیاست کا لفظ جانوروں کی دیکھ بھال اور نگہبانی کے مفہوم سے نکلا ہے اور اصطلاحاً اس سے مراد اہل ملک کے امور کی تدبیر و اصلاح ہے۔ اسلامی مفکرین نے سیاست کو رعایا کی فلاح کے لیے قانون شریعت کی روشنی میں تدبیر اختیار کرنا قرار دیا ہے۔ اسلام چونکہ انسان کو صرف نماز روزے کی ہدایت نہیں دیتا بلکہ نکاح و طلاق، معاملات و تجارت، جرائم و سزائیں، جنگ و صلح اور حکمرانی کے اصول بھی بیان کرتا ہے، اس لیے سیاست اس کے نظام کا تقریباً حصہ ہے۔ دین اور دنیا کی یہ وحدت اسلام کو اس فلسفے سے الگ کرتی ہے جس میں مذہب کو کلیسا اور ضمیر تک محدود کر دیا گیا تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسلام کسی ایک تاریخی دور کی متعین حکومتی صورت کو ہر دور کے لیے لازم قرار دیتا ہو؛ اصل زور ان مقاصد پر ہے جن کے لیے ریاست قائم ہوتی ہے۔

اسلامی سیاسی فکر کے مقاصد کو مفکرین نے دین و جان و مال و عقل و نسل کی حفاظت اور عدل و امن کے قائم کرنے جیسے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ریاست کا کام یہ ہے کہ وہ کمزور کو طاقت ور کے ظلم سے بچائے، باہمی نزاعات کا انصاف سے فیصلہ کرے، تعلیم و صحت اور راستوں کی حفاظت جیسے فلاحی امور کا انتظام کرے اور خارجی حملے سے دفاع کرے۔ امام ماوردی نے اپنی کتاب الاحکام السلطانیہ میں امامت یعنی سربراہی ریاست کے فرائض کو منظم انداز میں بیان کیا جن میں دین کی حفاظت، عدل کا نفاذ، حدود کا تحفظ، فوج اور سرحدوں کا انتظام اور بیت المال کی صوابدید شامل ہے۔ یہ فہرست ظاہر کرتی ہے کہ کلاسیکی اسلامی فکر میں سیاست کا مقام خالص عملی اور فلاحی تھا، نہ کہ ذاتی اقتدار کا کھیل۔

جدول: اسلامی سیاست کے بنیادی اصول

اصول	مفہوم	عملی نتیجہ
حاکمیت الٰہی	قانون کا آخری ماخذ وحی کی اقدار	حکمران قانون سے بالاتر نہیں
خلافت انسانی	انسان زمین پر اللہ کا نائب	اختیار امانت اور ذمہ داری ہے
شوریٰ	باہمی مشاورت سے فیصلہ	مشاورت حکمران پر لازم
عدل وانصاف	بلا تفریق حق کی ادائیگی	قانون کے سامنے سب برابر
امانت واحتساب	اختیار کی جواب دہی	احتساب کا نظام اور عوامی نگرانی
فلاح عامہ	ریاست کا مقصد رعایا کی بہبود	خدمت کو اقتدار پر ترجیح

حاکمیت، خلافت اور شوریٰ

اسلامی سیاست کا پہلا اصول یہ ہے کہ اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے؛ یعنی کسی انسان یا طبقے کو یہ حق نہیں کہ وہ حلال و حرام کے بنیادی اصولوں کو اپنی مرضی سے بدل دے۔ اس اصول کا سیاسی مفہوم یہ ہے کہ حکمران خواہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، وہ قانون سے بالاتر نہیں ہوتا اور اس کے اختیارات اخلاقی و آئینی حدود کے پابند ہوتے ہیں۔ دوسرا اصول خلافت انسانی کا ہے کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے، اس لیے اقتدار ایک امانت ہے جس کا حساب دینا ہو گا۔ حکمران کی یہ خود آگاہی اسے ظلم سے روکنے کی سب سے اندرونی اور مضبوط ضمانت بنتی ہے، جس کا متبادل محض بیرونی قوانین سے ممکن نہیں ہوتا۔

تیسرا اصول شوریٰ ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کی صفات میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان کے امور باہمی مشاورت سے چلتے ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اصحاب سے مشورہ کرنے کی تاکید کی گئی۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات و دیگر معاملات میں مشاورت کی عملی مثال قائم کی اور رائے اختلافات کو سنا۔ شوریٰ کا اصول اسلامی سیاست

کو آمریت سے الگ کرتا ہے اور اس میں اجتماعی دانش اور عوامی شمولیت کی روح موجود ہے۔ اگرچہ شوریٰ کی عملی صورت یعنی اس کے ارکان، طریق کار اور اختیارات کے تعین میں اہل علم کے ہاں دور کے تقاضوں کے مطابق وسعت موجود رہی ہے، مگر اصول اپنی جگہ مسلم ہے کہ کوئی حکمران من مانی سے فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔

ریاست مدینہ کا عملی نمونہ اور حکمران کا احتساب

اسلامی سیاست صرف نظریہ نہیں بلکہ اس کا پہلا عملی نمونہ ریاست مدینہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر مسجد نبوی کو عبادت و مشاورت کا مرکز بنایا، مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا اور میثاق مدینہ کی صورت میں ایک تحریری آئینی دستاویز مرتب فرمائی جس میں یہودی و دیگر قبائل کے حقوق و فرائض سمیت شہر کے دفاع اور داخلی نظم کے اصول متعین ہوئے۔ مورخین اس دستاویز کو دنیا کے اولین تحریری معاہدوں میں شمار کرتے ہیں۔ ریاست مدینہ میں بیت المال کا قیام، سفارت کاری، معاہدات اور عدل کی مثالوں نے یہ ثابت کیا کہ اسلامی نظام میں سیاست عبادت سے کٹا ہوا شعبہ نہیں بلکہ اسی اخلاقی بنیاد پر چلنے والا انتظامی نظام ہے۔

اس نمونے کی ایک روشن خصوصیت حکمران کا احتساب تھا۔ خلفائے راشدین نے اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھا؛ مسجد میں کھڑے ہو کر سوالوں کے جواب دیے اور غلطی کی نشاندہی پر قبول کرنے کا طرز دکھایا۔ اسلام میں حکمران کے لیے عدل کی شرط اتنی سخت ہے کہ ظالم حکمران کی اطاعت ظلم میں معاونت کے دائرے میں ناجائز سمجھی جاتی ہے، اگرچہ اس کے عملی و آئینی پہلو اہل علم و اہل قانون کے تفصیلی فیصلوں سے طے ہوتے ہیں۔ طاقت کی حرص کے برعکس خدمت کے جذبے کو اصل مقام دینا، اقتدار کو وراثت یا ذاتی مال نہ سمجھنا اور کمزور طبقے کی فلاح کو ترجیح دینا اسلامی سیاست کے وہ امتیازات ہیں جن کی گونج آج کی فلاحی ریاست کے تصور میں بھی سنائی دیتی ہے۔

دور حاضر میں اہمیت

آج کے دور میں دنیا کے بیشتر مسلم ممالک آئینی جمہوریتوں کے طور پر چل رہے ہیں اور ان میں اسلامی اصولوں کا اطلاق آئین، اسمبلیوں، عدالتوں اور اسلامی نظریاتی اداروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ پاکستان کے آئین میں بھی قرار داد مقاصد کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے ادارے موجود ہیں۔ علماء و مفکرین کے درمیان بحث

زیادہ تر اس طریق کار کی تفصیلات پر رہتی ہے، اصول یعنی عدل، شوریٰ، امانت، احتساب اور فلاح عامہ پر اتفاق تقریباً آفاقی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سیاست کا مقام بحث میں یک طرفہ نہیں؛ وہ ملکی آئین و قانون کے احترام کے ساتھ اصولوں کی رہنمائی کا متقاضی ہے۔

طالب علم کے لیے اس موضوع کا اصل سبق یہ ہے کہ سیاست کو محض تقریروں اور نعروں سے ہٹ کر اخلاق و مقاصد کی سطح پر سمجھا جائے۔ جو معاشرہ نچلی سطح سے یعنی گھر، محلے اور ادارے سے دیانت، مشاورت اور انصاف سیکھتا ہے اسی میں اعلیٰ سطح پر بھی اچھی حکمرانی پروان چڑھتی ہے۔ اس کے برعکس اگر سیاست مفاد پرستی اور رشوت کا بازار بن چکی ہو تو اس کی اصلاح کاغذی دعووں سے نہیں بلکہ کردار اور اداروں کی تعمیر سے آئے گی۔ اسلامی سیاسی فکر اسی تعمیر کے لیے اصول مہیا کرتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں سیاست کو دین سے الگ اور غیر متعلق نہیں سمجھا گیا بلکہ وہ اصلاح امور اور قیام عدل کا ذریعہ ہے۔ اس کے بنیادی اصول حاکمیت الٰہی، انسانی خلافت، شوریٰ، عدل، امانت اور فلاح عامہ ہیں اور اس کا پہلا عملی نمونہ ریاست مدینہ ہے۔ ان اصولوں سے حکمران قانون کے تابع، عوام کے سامنے جواب دہ اور معاشرے کے کمزور طبقات کا محافظ بنتا ہے۔ دور حاضر میں ان اصولوں کی معنویت برقرار ہے، البتہ ان کے آئینی و عملی اطلاق کا دائرہ ملکی آئین، قانون اور اہل علم ہے۔ یہ متوازن تفہیم اس بحث کو جذباتی انتہاؤں سے نکال کر علمی احترام عطا کرتی ہے اور طالب علم کو اسلامی نظام حکومت کی اصل روح سے آشنا کرتی ہے۔

سوال نمبر 4: الفارابی کے سیاسی نظریات (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ الفارابی کے سیاسی نظریات بیان کریں۔ (20)

تعارف

ابو نصر الفارابی (870ء تا 950ء) مسلم فلسفے کے عظیم ترین مفکرین میں سے ہیں جنہیں ارسطو کے بعد المعلم الثانی یعنی دوسرا استاد کہا جاتا ہے۔ وہ ترکستان کے علاقے فاراب میں پیدا ہوئے، بغداد میں تعلیم پائی اور زندگی کا بڑا حصہ حلب و دمشق میں تصنیف و مطالعے میں گزارا۔ فارابی کی علمی خدمات منطق، ریاضی، موسیقی، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات تک پھیلی ہوئی ہیں، مگر ان کی سب سے نمایاں شناخت ان کا سیاسی فلسفہ ہے۔ انہوں نے یونانی سیاسی فکر خصوصاً افلاطون کی جمہوریہ اور ارسطو کی سیاست کو اسلامی افکار کے ساتھ جوڑ کر ایک منظم سیاسی نظریہ پیش کیا جس کی تفصیل ان کی مشہور کتاب آراء اہل المدینۃ الفاضلہ یعنی مدینہ فاضلہ کے باشندوں کے نظریات میں ملتی ہے۔

اس جواب میں الفارابی کے سیاسی نظریات کو ترتیب سے بیان کیا جائے گا۔ پہلے ان کے نظریے کی بنیاد یعنی انسان کی سماجی فطرت اور سعادت کا تصور واضح ہو گا، پھر مدینہ فاضلہ یعنی مثالی ریاست کا خاکہ، اس کے سربراہ کی صفات، شہریوں کے طبقات اور ریاستوں کی اقسام یعنی فاضلہ کے مقابل جاہلہ اور فاسقہ ریاستوں پر بحث آئے گی۔ آخر میں فارابی کے نظریات کی اہمیت و تنقیدی جائزے کے ساتھ نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ فارابی کا فلسفہ تشریح طلب ہے؛ یہاں پیش کیا گیا بیان درسی سطح کی متفقہ تعبیرات پر مبنی ہے اور کسی اختلافی فلسفیانہ جزئی کو حتمی دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا۔

سیاسی نظریے کی بنیادیں: تعاون اور سعادت

فارابی کے سیاسی فلسفے کی بنیاد یہ اصول ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے، یعنی کمال و سعادت تک اکیلے نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کی بہت سی ضرورتیں صرف اجتماع ہی سے پوری ہوتی ہیں۔ خوراک و لباس سے لے کر علم و اخلاق تک ہر میدان میں انسان دوسروں کا محتاج ہے۔ اس لیے انسان اجتماعات بناتا ہے جن کی اقسام فارابی نے چھوٹی سے بڑی ترتیب میں بیان کیں: گھر، محلہ، گاؤں، شہر اور پھر قوم و ممالک کا وسیع اجتماع۔ ان کے نزدیک کامل اجتماع وہ شہر یا ریاست ہے جس میں تمام پیشے اور ادارے مل کر شہریوں کو سعادت کی طرف لے جائیں۔ اس طرح سیاست کا مقصد فارابی کے ہاں محض امن و نظم نہیں بلکہ انسانی سعادت یعنی دنیوی کامرانی کے ساتھ اخلاقی و عقلی کمال بھی ہے۔

سعادت کے اس تصور کو سمجھنے کے لیے فارابی کے نظام فکر کو دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے نزدیک ہر انسان کی اصل غایت اپنے عقل و اخلاق کی تکمیل ہے اور ریاست کا کردار یہ ہے کہ وہ ایسا ماحول بنائے جس میں ہر شہری اپنی استعداد کے مطابق اس کمال کی طرف بڑھ سکے۔ اسی لیے فارابی ریاست کو جسم انسانی سے تشبیہ دیتا ہے؛ جس طرح جسم میں دل سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے اور باقی اعضا اس کی تنظیم میں کام کرتے ہیں، اسی طرح ریاست میں سربراہ مرکز ہوتا ہے اور باقی ادارے و طبقات اس کے تحت اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ عضویاتی تشبیہ فارابی کے ہاں اتفاقی نہیں بلکہ اس کی سیاست کی روح ہے کہ نظام کی صحت مرکز کی اہلیت اور اجزا کی ہم آہنگی میں ہے۔

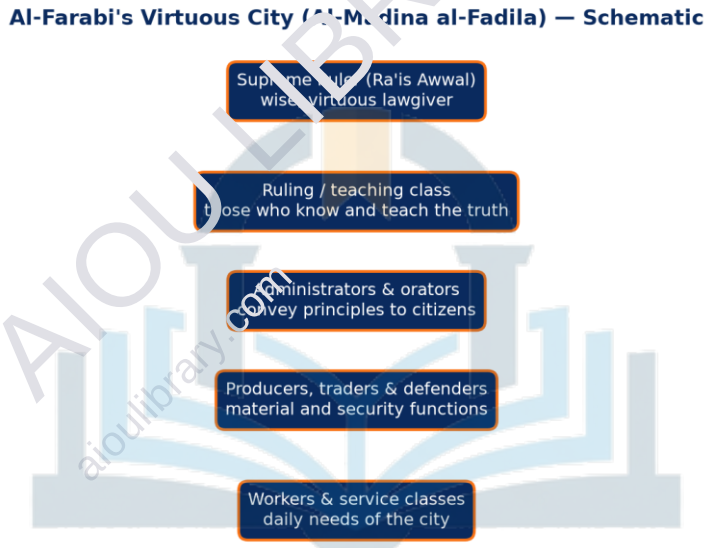

شکل: الفارابی کے مدینہ فاضلہ کا تنظیمی خاکہ (مطالعے کے لیے تمثیلی شکل)

مدینہ فاضلہ اور اس کا سربراہ

مدینہ فاضلہ فارابی کی مثالی ریاست ہے جس میں حکمران، قوانین اور شہری سب سعادت کی غایت کے گرد متحد ہوتے ہیں۔ فارابی کے نزدیک اس ریاست کا سربراہ سب سے اہم شخصیت ہے کیونکہ پورا نظام اس کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ سربراہ کے لیے اس نے اعلیٰ صفات بیان کیں جن میں مکمل جسمانی و ذہنی صحت، تیز فہم، مضبوط حافظہ، فصاحت، علم کی محبت، صدق و عدل سے رغبت، دنیوی لذتوں سے بے رغبتی، بلند ہمتی اور فیصلہ کرنے کی قوت شامل ہے۔ سب سے اہم شرط یہ ہے کہ سربراہ عقلی کمال کی اس منزل پر ہو

جہاں وہ حقائق کو براہ راست سمجھتا ہو اور وحی و الہام کی اہلیت بھی رکھتا ہو؛ یعنی فارابی کے مثالی حکمران کی صورت میں فلسفی اور نبی کی خوبیاں یکجا ہوتی ہیں۔ اسی لیے اس کا تصور حکمران افلاطون کے فلسفی بادشاہ کا اسلامی تبادل سمجھا جاتا ہے۔

فارابی یہ بھی واضح کرتا ہے کہ جب ایسی جامع صفات ایک فرد میسر نہ ملیں تو ریاست کی سربراہی ایسے فرد یا جماعت کے سپرد ہو سکتی ہے جن میں یہ صفات مجموعی طور پر پائی جاتی ہوں، یا پھر سابقہ عظیم حکمران کے وضع کردہ قوانین پر عمل کرنے والے جانشین حکومت کریں۔ قوانین کا تحفظ اور ان پر استقامت اس صورت میں دوسری بہترین صورت ہے۔ اس نکتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارابی کا نظریہ خیالی دنیا میں گم نہیں ہوتا بلکہ وہ عملی متبادلات بھی بتاتا ہے۔ جدید اصطلاح میں اسے ادارہ جاتی تسلسل اور قانون کی حکمرانی کے قریب سمجھا جا سکتا ہے، اگرچہ اس تشبیہ کو بھی بیان ہم فارابی کے ذاتی الفاظ نہیں بلکہ مفہوم کی وضاحت کے طور پر لیتے ہیں۔

شہریوں کے طبقات اور ریاستوں کی اقسام

مدینہ فاضلہ کے شہریوں کو فارابی ان کے افعال کے مطابق درجات میں تقسیم کرتا ہے۔ سربراہ کے بعد وہ طبقہ آتا ہے جو نظری و عملی حکمت سمجھتا اور اس کی تبلیغ و تعلیم کرتا ہے، پھر وہ لوگ جو تعلیم یافتہ اقدار کو عام شہریوں کے لیے مثالوں اور خطابت سے واضح کرتے ہیں، اس کے بعد انتظامی و مادی ذرائع فراہم کرنے والے طبقات اور آخر میں وہ لوگ جو جسمانی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ ہر طبقے کی قدر اس کے فعل کے مطابق ہے اور پورا شہر سعادت کی طرف اسی منظم تعاون سے بڑھتا ہے۔ اس تقسیم کا مقصد ذاتی تحقیر نہیں بلکہ ہر انسان کو اس کی استعداد کے موزوں مقام پر رکھنا ہے، جس سے سماجی ہم آہنگی باقی رہتی ہے۔

جدول: الفارابی کے ہاں ریاستوں کی اقسام

حیثیت	خصوصیت	قسم
مثالی ریاست	سعادت مقصود، اہل حکمران، منظم طبقات	مدینہ فاضلہ
ناقص اقسام کی کئی صورتیں	سعادت سے بے خبری؛ دولت، شہرت یا قبضہ مقصود	مدینہ جاہلہ

علم کے باوجود انحراف	سعادت کو جانتے ہوئے اس کے خلاف عمل	مدینہ فاسقہ
زوال پذیر ریاست	پہلے فاضلہ تھی پھر اس کے اصول بدل گئے	مدینہ مبدلہ
راہ سے بھٹکی ہوئی ریاست	گمراہ کن عقائد و قیادت کا شکار	مدینہ ضالہ

فاضلہ کے مقابل فارابی ریاستوں کی ناقص اقسام بھی گنتا ہے جو اس کے تجزیے کا سماجی پہلو واضح کرتی ہیں۔ ایسی ریاست جس کے باشندے سعادت کو جانتے ہی نہیں اور مختلف دنیوی اغراض یعنی بقا، دولت، شہرت، لذت یا اقتدار کو اصل مقصد بناتے ہیں وہ مدینہ جاہلہ ہے اور اس مقاصد کے فرق کے مطابق اس کی کئی ذیلی صورتیں بنتی ہیں۔ جو شہر سعادت کو جانتا ہو مگر اعمال جاہل شہروں جیسے رکھے وہ فاسقہ ہے۔ جو پہلے فاضلہ ہو اور پھر اس کے عقائد و اعمال بدل جائیں وہ مبدلہ ہے اور جو گمراہ کن خیالات پر قائم ہو وہ ضالہ کہلاتا ہے۔ اس درجہ بندی سے ہر دور کے سیاسی نظاموں کو پرکھنے کا ایک فلسفیانہ پیمانہ ملتا ہے کہ ریاست کا جائزہ اس کے مقاصد اور قیادت کی اہلیت سے لگایا جائے نہ کہ محض طاقت و وسعت سے۔

اہمیت اور تنقیدی جائزہ

فارابی کے سیاسی نظریات کی اہمیت اس امر میں ہے کہ انہوں نے مسلم فکر میں سیاسی فلسفے کو منظم علم کی صورت دی۔ مدینہ فاضلہ کی کتاب کو بعض محققین افلاطون کی جمہوریہ کے بعد سیاسی فلسفے کی عظیم ترین کلاسیکی کوششوں میں شمار کرتے ہیں۔ فارابی نے وحی و عقل، مذہب و فلسفہ کے باہمی تعلق پر ایسا خاکہ دیا جس نے بعد میں ابن سینا، الغزالی اور ابن رشد تک کو متاثر کیا۔ اس احصاء علوم یعنی علوم کی درجہ بندی میں اس نے علم مدنی یعنی سیاست کو باقاعدہ علم کے درجے میں شامل کیا۔ مزید یہ کہ حکمران کے لیے علم و اخلاق کی شرط، ریاست کے مقصد کو سعادت قرار دینا اور ریاستوں کی اخلاقی بنیادوں پر درجہ بندی، یہ سب آج کے سیاسی مطالعات میں بھی قابل غور مباحث ہیں۔

تنقیدی پہلو سے یہ کہا جاتا ہے کہ فارابی کا مثالی حکمران اتنی اعلیٰ صفات کا حامل ہے کہ عملی دنیا میں اس کا ملنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے، اس لیے اس کا نظام زیادہ تر فلسفیانہ آدرش رہ جاتا ہے۔ طبقاتی تقسیم کو بھی جدید جمہوری نقطہ نظر سے ناقدانہ دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس میں عوامی شرکت اور مساوات کی گنجائش محدود نظر آتی ہے۔ اس کے بعض مابعد

الطبیعیاتی تصورات مثلاً عقول کا نظریہ بھی فلسفیانہ اختلاف کا موضوع رہے ہیں جن پر اسلامی مفکرین نے نقد بھی کیا۔ اس سب کے باوجود یہ تنقیدیں فارابی کی عظمت کم نہیں کرتیں؛ بلکہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ایک زندہ فکری روایت کا آغاز تھا جسے بعد کے مفکرین نے قبول، تنقید اور ترمیم کے ذریعے آگے بڑھایا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ الفارابی کے سیاسی نظریات کا محور مدینہ فاضلہ ہے جہاں ریاست کا مقصد شہریوں کی سعادت، حکمران کی بنیاد علم و اخلاق اور نظام کی اساس منظم تعاون ہے۔ اس نے سعادت سے بے خبر یا منحرف ریاستوں کی درجہ بندی کر کے سیاسی انحراف کی تشخیص بھی کی۔ اس کے تصورات نے مسلم سیاسی فکر کو فلسفیانہ گہرائی عطا کی اور یونانی و اسلامی روایت کو آپس میں جوڑا۔ اگرچہ اس کے آدرش پر عملی تنقیدات موجود ہیں، مگر حکمرانی کو علم، عدل اور اعلیٰ مقصد سے جوڑنے کا اس کا پیغام آج بھی اتنا ہی تازہ ہے۔ طالب علم کے لیے اس بحث کی قدر یہ ہے کہ وہ ریاست کا مطالعہ صرف اداروں سے نہیں بلکہ مقاصد و اقدار سے کرنا سیکھے۔

سوال نمبر 5: جمہوریت کی خامیاں (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ جمہوریت کی خامیاں بیان کریں۔ (20)

تعارف

جمہوریت موجودہ دور کا سب سے مقبول نظام حکومت ہے جس کا بنیادی نعرہ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے ہے۔ اس نظام میں حکومت کا اختیار عوام کے منتخب نمائندوں کے پاس ہوتا ہے، بنیادی حقوق کی ضمانت دی جاتی ہے اور حکمرانوں کو ووٹ کے ذریعے بدلے جانے کا امکان موجود رہتا ہے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے بیشتر ممالک جمہوریت کو ہی قابل قبول نظام سمجھتے ہیں۔ تاہم جمہوریت کی تاریخ جتنی قدیم ہے اس پر تنقید بھی اتنی ہی قدیم ہے۔ افلاطون نے قدیم یونان ہی میں جمہوریت کے خطرات گنائے تھے اور آج بھی مفکرین اس کی خامیوں پر تفصیل سے بحث کرتے رہتے ہیں۔

اس جواب میں جمہوریت کی ان خامیوں کا منظم جائزہ لیا جائے گا جن پر درسی نصاب اور سیاسی مفکرین میں بحث ہوتی ہے۔ اکثریت کی آمریت، غیر اہل قیادت کا ابھرنا، عوام کی جہالت و جذباتی فیصلے، دولت و میڈیا کا غلبہ، جماعتی مفادات، اقلیتوں کے حقوق، مختصر مدت کی پالیسیاں اور فیصلہ سازی کی سست روی جیسے عنوانات الگ الگ بیان ہوں گے۔ واضح رہے کہ یہ بحث جمہوریت کی خامیوں کا علمی تجزیہ ہے۔ اس کا مقصد کسی غیر آئینی نظام کی تلقین نہیں، بلکہ مسئلے کی وہ سمجھ ہے جو ہر نظام کو بہتر بنانے کے لیے درکار ہوتی ہے، اور یہ بات خود جمہوری مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔

اکثریت کی آمریت اور اقلیتوں کے مسائل

جمہوریت کی سب سے مشہور خامی اکثریت کی آمریت ہے۔ جب حکومت کا اختیار محض تعداد پر منحصر ہو تو اکثریت اپنے فیصلے اقلیت پر مسلط کر سکتی ہے اور عددی برتری ہی حق کا پیمانہ بن جاتی ہے۔ تاریخ میں کئی بار جمہوری اکثریت نے نسل، زبان یا مذہب کی بنیاد پر اقلیتوں کے حقوق کو پامال کیا ہے۔ افلاطون کی مشہور تنقید بھی یہی تھی کہ جمہوریت میں آزادی کی زیادتی آخر کار اس لیڈر کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے جو جذبات بھڑکا کر پوری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ یوں جمہوریت بظاہر آمریت کی ضد ہے مگر اس کے اندر اکثریتی استبداد کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اسی لیے جدید جمہوریتیں آئین، بنیادی حقوق اور آزاد عدلیہ جیسی رکاوٹیں کھڑی کرتی ہیں، جو دراصل اسی خامی کا اعتراف اور اس کا علاج ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کثرت رائے کا اصول اکثر فکری اختلاف کو ختم کر دیتا ہے۔ عام آدمی سیاسی و معاشی پیچیدہ مسائل کی تکنیکی تفصیل سے واقف نہیں ہوتا، اس لیے انتخابی فیصلے اکثر شخصیات، نعروں اور برادری و زبان جیسے عوامل کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ووٹ کی مساوات مثلاً ایک عالم اور ایک غیر خواندہ کے ووٹ کی یکساں قیمت اس اصول کو معرض بحث بناتی ہے کہ کیا ریاستی فیصلوں میں رائے کا وزن معلومات کے بغیر برابر ہونا چاہیے۔ جمہوریت کے حامی اس کا جواب تعلیم عام کرنے اور میڈیا کی اصلاح میں تلاش کرتے ہیں، جبکہ ناقدین کہتے ہیں کہ مسئلہ نظام کی ساخت میں ہے، جہاں وقتی مقبولیت دیرپا مصلحت پر حاوی آ جاتی ہے۔

قیادت، جماعتیں اور دولت و میڈیا کا غلبہ

جمہوریت کی تیسری خامی غیر اہل اور موقع پرست قیادت کے ابھرنے کا امکان ہے۔ انتخاب جیتنے کے لیے جس مہارت کی ضرورت ہوتی ہے یعنی خطابت، تنظیم، دولت اور تشہیر، وہ حکمرانی کی مہارت یعنی علم، تجربہ و کردار سے مختلف ہوتی ہے۔ نتیجتاً اکثر ایسے افراد ایوانوں تک پہنچ جاتے ہیں جو وعدوں کے سہارے منتخب تو ہو جاتے ہیں مگر پالیسی سازی کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس مسئلے کو قدیم ناقدین نے خوشامدی قیادت کی اصطلاح سے بیان کیا ہے کہ عوامی پسند کے پیچھے چلنے والا رہنما سچ کہنے کے بجائے وہی کہتا ہے جو سننے والوں کو خوش کرے۔ جب فیصلے سروے اور مقبولیت کے حساب سے ہونے لگیں تو نامقبول مگر ضروری اصلاحات کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

چوتھی بڑی خامی دولت اور تشہیر کی سیاست ہے۔ جدید انتخابات اتنے مہنگے ہو چکے ہیں کہ عام دیانت دار شہری کے لیے انتخاب لڑنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ سرمایہ کار اور بڑے گروہ پارٹی فنڈز دے کر منتخب حکومتوں سے مراعات حاصل کرتے ہیں، جسے پالیسی ساز طبقات کی اجارہ داری کہا جاتا ہے۔ میڈیا کی ملکیت بھی چند بڑے گروہوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے عوامی رائے تیار کرنے میں جانبداری کا عنصر آ جاتا ہے۔ سیاسی جماعتیں بھی اصول کے بجائے اقتدار کو مقصد بنانے پر پارٹی مفاد کو قومی مفاد پر فوقیت دیتی ہیں، ارکان کی خرید و فروخت اور مفاداتی اتحاد عام ہو جاتے ہیں اور عوام کا جمہوریت سے اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ پاکستان سمیت بہت سی نوجوان جمہوریتوں میں یہ صورتیں براہ راست دیکھی جاتی ہیں۔

جدول: جمہوریت کی نمایاں خامیاں اور ان کے اثرات

اثر	مفہوم	خامی
اقلیتوں کے حقوق کو خطرہ	تعداد ہی فیصلے کی بنیاد	اکثریت کی آمریت
کمزور پالیسی سازی	مقبولیت اہلیت پر حاوی	غیر اہل قیادت
دیانت دار شہری کی سیاست سے دوری	دولت کا فیصلہ کن کردار	مہنگے انتخابات

بدعنوانی وعدم استحکام	پارٹی مفاد قومی مفاد سے اوپر	جماعتی مفاد پرستی
طویل المدت اصلاحات مؤخر	اگلے انتخاب کی فکر	قلیل مدتی پالیسیاں
ہنگامی حالات میں تاخیر	طویل بحث وطریقہ کار	فیصلوں کی سست روی

قلیل مدتی پالیسیاں، عدم استحکام اور دیگر خامیاں

جمہوری حکومتوں کی مدت چند سال کی ہوتی ہے اس لیے وہ ان کاموں کو ترجیح دیتی ہیں جن کا فائدہ اگلے انتخاب سے پہلے ظاہر ہو جائے۔ تعلیم، صحت اور ادارہ سازی جیسی طویل مدت کی اصلاحات کا فائدہ برسوں بعد ظاہر ہوتا ہے، اس لیے وہ نظر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ سبسڈی اور قرض جیسی مقبول لیکن معیشت کے لیے نقصان دہ پالیسیاں اسی دباؤ کی پیداوار ہیں۔ مزید یہ کہ مخلوط حکومتوں اور باری باری بدلتی ہوئی حکومتوں کی وجہ سے پالیسیوں میں تسلسل نہیں رہتا، سرمایہ کار غیر یقینی کیفیت سے گھبراتے ہیں اور ریاستی منصوبے ہر حکومت کی تبدیلی کے ساتھ نئے سرے سے شروع ہوتے ہیں۔

دیگر خامیوں میں بیوروکریسی اور فیصلہ سازی کی رفتار بھی شامل ہے۔ پارلیمانی بحث، کمیٹیوں اور قانونی مراحل کی وجہ سے ہنگامی اور دفاعی معاملات میں بروقت فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ نکتہ اٹھایا جاتا ہے کہ محض اکثریتی منظوری کسی اخلاقی اصول کو درست نہیں بنا دیتی؛ اگر اکثریت کسی ظلم یا غیر اخلاقی قانون کی حمایت کر دے تو جمہوری اصول کے پاس اسے رد کرنے کی اندرونی بنیاد نہیں رہتی۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں اسلامی سیاسی فکر کا موقف سامنے آتا ہے کہ قانون سازی بنیادی اخلاقی و شرعی حدود سے آزاد نہیں ہو سکتی، اور اس موضوع کا تفصیلی اصولی فیصلہ اہل علم و آئین کے دائرے میں ہوتا ہے۔ ان خامیوں کی روشنی میں مفکرین اصلاح کی صورتیں تجویز کرتے ہیں جیسے آئینی حدود، آزاد عدلیہ، دیانت دار انتخابی نظام اور عوامی تعلیم۔

اسلامی نقطہ نظر سے موازنہ اور متوازن جائزہ

ناقدین جمہوریت کو اسلامی اصولوں سے موازنہ کر کے چند نمایاں فرق بھی بیان کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں قانون سازی کی بنیاد وحی کی اخلاقی حدود ہیں اور اکثریت کو بھی ان حدود سے تجاوز کا حق نہیں ملتا، جبکہ لادینی جمہوریت میں نظری طور پر اکثریت کسی بھی قانون کو جائز قرار دے سکتی ہے۔ شوریٰ میں مشورہ اہل رائے و اہل حل و عقد سے منسلک کیا جاتا ہے، جبکہ جدید انتخابی نظام میں ہر رائے مساوی گنتی میں آتی ہے۔ متوازن جائزہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ جمہوریت کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے یعنی پرامن انتقال اقتدار، بنیادی حقوق، احتساب کے باقاعدہ ادارے اور عوامی شرکت جیسی چیزیں وہیں جن کی مکمل نفی ممکن نہیں۔ دنیا کے بیشتر مسلم ممالک اور پاکستان کی عملی صورت یہ ہے کہ جمہوری ڈھانچے کو ہی آئینی و اسلامی اداروں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسی لیے جدید علمی حلقوں میں بحث نظام کی تبدیلی کے بجائے اصلاحات پر مرکوز رہتی ہے۔ انتخابی اخراجات کی حد مقرر کرنا، پارٹی فنڈنگ کی شفافیت، مقامی حکومتوں کو مضبوط کرنا، عدلیہ و میڈیا کی آزادی کے ساتھ ذمہ داری اور شہری تعلیم کا فروغ ایسے اقدامات ہیں جن سے جمہوریت کی بہ خامیاں کم کی جا سکتی ہیں۔ افلاطون سے لے کر دور حاضر تک کی تنقید کا اصل فائدہ بھی یہی ہے کہ جمہوریت کو بے نقاب کرنے کے بجائے اسے خود احتسابی پر آمادہ کیا جائے۔ اس تجزیے سے طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ ہر نظام انسانی کوشش کا نتیجہ ہے، اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور کمزوریاں بھی؛ اصل فضل اس معاشرے کو ہے جو اپنی خامیاں پہچان کر انہیں درست کرنے کی دائمی کوشش کرتا رہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جمہوریت کی خامیاں اکثریت کی آمریت، اقلیتوں کے حقوق کی غیر یقینی صورت، غیر اہل و خوشامدی قیادت، دولت و میڈیا کے غلبے، جماعتی مفاد پرستی، قلیل مدتی پالیسیوں اور فیصلہ سازی میں سست روی کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔ اخلاقی سطح پر اکثریت کو حق کا واحد پیمانہ ماننا بھی تنقید کی زد میں ہے۔ ان خامیوں کا اعتراف خود جمہوری مفکرین کرتے ہیں اور آئینی پابندیاں و ادارہ جاتی توازن انہی کے سدباب کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ متوازن نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جمہوریت کو جانچنے کا اصل پیمانہ یہ نہیں کہ وہ کامل نظام ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کی گنجائش رکھتا ہے یا نہیں؛ اسی گنجائش کو برقرار و وسیع کرنا ہی اس بحث کا عملی فائدہ ہے۔